15

آئندہ نسلوں میں قربانی، محنت، اور بروقت کام کرنے کی روح کس طرح پیدا کی جائے

(فرمودہ 4 مئی 1945ء)

تشہد، تعوّذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:

"تین دن کی بات ہے ڈلہوزی میں مَیں نے ایک رؤیا دیکھا کہ کوئی شخص ماریسن نامی انگریز ہیں وہ کہتے ہیں کہ چالیس سال کے عرصہ تک کانگڑہ کے ضلع میں میرے جیسا اور عقلمند آدمی پیدا نہیں ہوگا یا شاید یہ کہا ہے کہ پایا نہیں جائے گا۔ میں اُس وقت رؤیا میں سمجھتا ہوں کہ ماریسن سے وہ وزیر مراد ہے جو لیبر پارٹی کی طرف سے وزارت میں شامل ہیں۔ یہ فقرہ سن کر میرے دل میں فوراً یہ بات گزری کہ "انشاء اللہ" انہوں نے نہیں کہا۔ اگر یہ "انشاء اللہ" کہہ لیتے تو اچھا تھا۔ پھر ساتھ ہی میرے دل میں یہ سوال بھی پیدا ہوا کہ کانگڑے کے ساتھ ان کا کیا تعلق ہے۔ کانگڑہ ہندوستان کا علاقہ ہے اور یہ انگلستان کے رہنے والے ہیں۔ اس سوال کے پیدا ہوتے ہی میرے دل میں یہ بات ڈالی گئی کہ کانگڑے کا لفظ استعارۃً انگلستان کے لئے بولا گیا ہے۔ اور کانگڑے میں چونکہ آتش فشاں پہاڑ ہیں اس لفظ میں انگلستان کی آئندہ حالت کو ظاہر کیا گیا ہے کہ انگلستان میں بھی بہت کچھ ردّوبدل اور اُتار چڑھاؤ کا زمانہ آرہا ہے اور جس طرح آتش فشاں علاقے میں زلزلے آتے رہتے ہیں اِسی طرح انگلستان میں بھی سیاسی اور اقتصادی

اُتار چڑھاؤ رونما ہونے والے ہیں۔ اور مسٹر ماریسن کے قول کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایسے تغیرات اور فساد کے وقت مَیں سب سے اچھا کام کرنے والا ثابت ہوں گا۔

اس رؤیا سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگ جو بظاہر اب ختم ہو رہی ہے اس کو ختم نہیں سمجھنا چاہیے۔ بلکہ اس جنگ کے نتائج میں بعض اَور ایسی باتیں پیدا ہونے والی ہیں جن کی وجہ سے شورش اور جھگڑے، اختلافات اور مناقشات کا سلسلہ جاری ہو جائے گا۔ اور نہ صرف یہ کہ یہ جھگڑے اور فسادات جیسا کہ پہلی بعض رؤیا میں بتایا جا چکا ہے انگلستان سے باہر رونما ہوں گے بلکہ خود انگلستان میں بھی مناقشات اور اختلافات کا دروازہ زیادہ وسیع ہو جائے گا۔ اور انگلستان کانگڑے کے علاقہ کی طرح ایک آتش فشاں مادہ رکھنے والا ملک ثابت ہو گا۔ مگر ساتھ ہی اِس میں اِس بات کی خبر معلوم ہوتی ہے کہ انگلستان ان جھگڑوں اور فسادات کے نتیجہ میں تباہ نہیں ہو گا کیونکہ رؤیا میں ایک شخص کی زبانی یہ کہا گیا ہے کہ میرے جیسا دانا اور سمجھ دار آدمی اتنے سالوں میں کوئی نہیں ہو گا۔ ایسا فقرہ وہی کہا کرتا ہے جو ان مناقشات اور فسادات کو کم کرنے یا دور کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ لیبر پارٹی کی وجہ سے جن خطرات کا امکان پایا جاتا ہے وہ خطرات مسٹر ماریسن کے اثر کے نتیجہ میں دور ہو جائیں یا کم ہو جائیں یا ممکن ہے کہ مسٹر ماریسن اپنی پارٹی کو بدل کر کسی اَور پارٹی میں شامل ہو جائیں اور ان کو ایسا کام کرنے کا موقع مل جائے۔ بعض دفعہ ناموں کی تعبیر بھی ہوتی ہے۔ ممکن ہے اس نام کی بھی تعبیر ہو۔ مجھے اِس وقت اِس نام کے معنے معلوم نہیں۔ اور اگر ظاہر مراد ہے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ مسٹر ماریسن کو کوئی بڑا کام کرنے کا موقع ملے گا۔

میں اس سے پہلے مسٹر ماریسن کے متعلق ذاتی طور پر کوئی واقفیت نہیں رکھتا۔ مجھے ان کے متعلق بہت ہی کم ذاتی واقفیت ہے جو نہ ہونے کے برابر ہے۔ لیکن اخباری لحاظ سے بھی مسٹر ماریسن کے متعلق کوئی ایسی معلومات حاصل نہیں جن کی وجہ سے ان سے کوئی لگاؤ ہو۔ بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ خوابیں دماغی خیالات کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو میری خواب میں ان لوگوں میں سے کسی کا نام آنا چاہیے تھا جن کے ساتھ ہمارے ذاتی تعلقات رہے ہیں یا جو سیاسی لحاظ سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں یا جن سے ہماری جماعت کو کام پڑے ہیں۔ اگر اس بناء پر

کوئی نام آتا تو سیاسی لحاظ سے مسٹر چرچل(Mr.Churchill)کا نام آنا چاہیے تھا یا ہندوستان کے تعلقات کے لحاظ سے مسٹر ایمری کا نام آنا چاہیے تھا۔ یا پرانے تعلقات کے لحاظ سے ارل ونٹرسن، سر ٹیلر (Sir Taylor)یالارڈ ہیلی فیکس(Lord Halifax)کا نام آنا چاہئے تھا۔ یا کشمیر کے معاملہ کے وقت کے میل جول کے لحاظ سے لارڈ ٹسپٹن کا نام آنا چاہئے تھا جو پہلے سموئیل ہوم(Samuel Holme) کہلاتے تھے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن میں سے بعض کے ساتھ ہمارے تعلقات جماعتی طور پر رہے ہیں اور ہم نے ان سے کوئی کام لیا ہے۔ اور بعض وہ ہیں جن سے چودھری ظفر اللہ خان صاحب کو ملنے کا موقع ملا ہے۔ یا بعض لوگ ایسے ہیں جن سے براہِ راست ہمارا کوئی تعلق نہیں لیکن سیاسی لحاظ سے وہ انگلستان کی زندگی میں اہمیت رکھتے ہیں۔

پس یہ الٰہی خواب ہونے کا ایک نشان اور ثبوت ہے کہ ایسے شخص کے متعلق خبر دی گئی ہے جن کے ساتھ گزشتہ زمانہ میں ہمارا کوئی تعلق نہیں رہا اور عقل باور نہیں کر سکتی کہ ایسے شخص کو چننے کی دماغ کوئی خاص مناسبت رکھتا تھا۔ دماغ تو ایسے ہی آدمیوں کو چُن سکتا ہے جن کے ساتھ سابق میں کوئی تعلق رہا ہو۔ لیکن ایسا شخص جس کے ساتھ نہ ہمارے دوستوں کا کوئی تعلق ہے نہ ہی ہمارا اس سے کوئی واسطہ ہے اور نہ ہی اس نے کوئی ایسا کام کیا ہے جس کی وجہ سے وہ نمایاں حیثیت سے آگے آیا ہو اور لوگوں کی توجہ اپنی طرف کھینچ رہا ہو۔ اس کا نام بتایا جانا اس امر کا بیّن ثبوت ہے کہ یہ خواب دماغی نہیں بلکہ خدائی ہے۔

اِس کے بعد میں آج کے خطبہ کا مضمون لیتا ہوں۔ میں نے بار بار جماعت کو توجہ دلائی ہے کہ قومیں اگلی نسل سے بنا کرتی ہیں کوئی قوم اپنی زندگی کا اعتبار نہیں کر سکتی۔ اگر اس کی اگلی نسل کارآمد، نیک اور محنتی نہ ہو۔ جب کبھی قوم پر زوال آتا ہے تو آئندہ نسلوں سے آتا ہے اور جب بھی ترقی ہوتی ہے تو وہ بھی آئندہ نسلوں سے ہوتی ہے۔ دوام بخشنے والی چیز اولاد ہی ہے۔ اگر اولاد انسان کو حاصل ہوتی ہے تو اُس خاندان کا نام رہتا ہے اور اگر اچھی اولاد حاصل ہوتی ہے تو اس کے مذہب اور اس کی قوم کا نام رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو انسان کے اندر اولاد کی خواہش رکھی ہے یہ اِس بات کا ثبوت ہے کہ اللہ تعالیٰ بنی نوع انسان کو دوام بخشنا چاہتا ہے۔ ہر ماں اور ہر باپ ایک لڑکے یا لڑکی کی جستجو میں رہتے ہیں۔ جن گھروں میں اولاد نہیں ہوتی باپ

بھی اور مائیں بھی سخت غمزدہ ہوتی ہیں۔ کبھی طبیبوں سے علاج کراتے ہیں، کبھی دائیوں سے مشورے لیتے ہیں، کبھی دعائیں کرتے اور دعائیں کراتے ہیں کہ ہمارے ہاں اولاد نہیں، اولاد ہو جائے۔ حالانکہ اولاد کیا فائدہ پہنچاتی ہے؟ کچھ بھی نہیں۔ ہزاروں ہزار انسان دنیا میں ایسے ہیں پچاس ساٹھ یا ستر فیصدی نہیں بلکہ نوے فیصدی لوگ ایسے ہیں جنہوں نے اپنی اولاد سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ اگر تو نوے فیصدی لوگ ایسے ہوتے کہ ان کی اولاد انہیں فائدہ پہنچاتی اور اُن کی خبر گیری کرتی تو ہم سمجھتے کہ اولاد کی خواہش انسان کے اندر اس لئے پیدا ہوتی ہے کہ وہ اولاد سے فائدہ اٹھائے مگر ہم تو دیکھتے ہیں کہ اِدھر اولاد جوان ہوتی ہے اور اُدھر وہ اپنے بیوی بچوں کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے۔ سینکڑوں بوڑھے میرے ذاتی علم میں ایسے ہیں جو اس بات کے محتاج تھے کہ اُن کی خبر گیری کی جاتی مگر اُن کے لڑکوں یا لڑکیوں نے اُن کی طرف توجہ نہیں کی۔ کیونکہ وہ لڑکیاں اپنے خاوندوں یا لڑکے اپنی بیویوں کے چونچلوں میں مشغول ہو گئے۔ یہ نظارہ عام طور پر دنیا میں نظر آتا ہے کہ گھروں میں ماں باپ کی قدر نہیں کی جاتی۔ گو بعض قدر کرنے والے بھی ہوتے ہیں مگر وہ خدمت سے قاصر رہتے ہیں اِدھر وہ جوان ہوئے اور اُدھر اُن کے ماں باپ دنیا سے چل بسے تو جب بالعموم یہ بات دنیا میں نظر آتی ہے تو ان حالات میں یہ شدید خواہش جو انسان کے دل میں اولاد کے متعلق پائی جاتی ہے وہ دماغی تأثرات کا نتیجہ نہیں قرار پا سکتی۔ بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ محض طبعی خواہش ہے۔ عقلی خواہش کی بنیاد ہمیشہ دلیل اور تجربہ پر ہوتی ہے لیکن طبعی خواہش کی بنیاد کسی دلیل پر نہیں ہوتی۔ پس جب دنیا میں اِس بات کی کوئی دلیل نظر نہیں آتی تو معلوم ہوا کہ یہ طبعی خواہش ہے جو خدا تعالیٰ نے بنی نوع انسان میں تسلسل قائم رکھنے کے لئے رکھی ہوئی ہے۔

کہتے ہیں کہ اولاد سے نام قائم رہتا ہے مگر نام کے لحاظ سے بھی دیکھا جائے تو کہاں قائم رہتا ہے؟ کوئی پوچھے کہ تمہارے پڑدادا کا نام کیا ہے؟ تو لوگ کہہ دیتے ہیں پتہ نہیں حالانکہ پڑدادا قریب کی چیز ہے۔ پڑدادا کے معنے ہیں باپ کا دادا۔ تو دنیا میں ہزاروں لاکھوں آدمی ایسے ہیں جو اپنے پڑدادا کا نام نہیں جانتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر کوئی اِس مسجد کے

دروازہ پر کھڑا ہو جائے اور وہ ہر گزرنے والے سے پوچھے کہ تمہارے پڑ دادا کا کیا نام ہے ؟ تو مجھے یقین ہے کہ پچاس فیصدی لوگ یہ کہیں گے کہ ہمیں پتہ نہیں۔☆ جب اتنی جلدی لوگ اپنے باپ دادوں کا نام بھول جاتے ہیں تو پھر اس دلیل کی کیا حقیقت باقی رہ جاتی ہے کہ اولاد ہو گی تو ہمارا نام قائم رہے گا۔ نام کہاں قائم رہتا ہے ؟ کتنے لوگوں کی اولاد ہے جو اپنے ماں باپ کے مرنے کے بعد ان کا ذکر کرتی ہے ؟ ان لوگوں کو دیکھ لو جن کے والدین فوت ہو چکے ہیں اور سوچو تو سہی کہ وہ کتنی دفعہ اپنے ماں باپ کا ذکر خیر کرتے ہیں ؟ بہت کم لوگ ایسے ہیں جو اپنے والدین کو یاد رکھتے ہیں۔ تحریک جدید سے اِس بات کا پتہ لگ جاتا ہے۔ تحریک جدید میں حصہ لینے والوں میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جنہوں نے اپنے ماں باپ کی طرف سے حصہ لیا ہے۔ مگر یہ لوگ دس فیصدی بھی نہیں بلکہ پانچ فیصدی بھی نہیں۔ پانچ فیصدی کے حساب سے پانچ ہزار میں سے اڑھائی سو بنتے ہیں۔ مگر میرے خیال میں تو اڑھائی سو بھی ایسے نہیں جنہوں نے اپنے ماں باپ کی طرف سے حصہ لیا ہو۔☆☆ تو ماں باپ کا تعلق بالکل قریب کا تعلق ہے مگر لوگ ان کو بھی یاد نہیں رکھتے۔ ماں باپ کس طرح تکلیف اٹھا کر اور اپنی ضرورت کو پیچھے ڈال ڈال کر بچوں کی پرورش کرتے اور ان کو پڑھاتے لکھاتے ہیں۔ لیکن وہی بچے جب بڑے ہو جاتے ہیں تو وہ اپنے والدین پر ایک پیسہ خرچ کرنے میں بھی دریغ محسوس کرتے ہیں۔ میرے پاس کئی ایسے جھگڑے آتے ہیں اور ماں باپ آکر یہ شکایت کرتے ہیں کہ ہم ضعیف ہو گئے ہیں اور ہمارے لڑکے ہماری خدمت نہیں کرتے۔ جب لڑکوں سے پوچھا جائے تو کہتے ہیں تنخواہ تھوڑی ہے دو اڑھائی سو روپیہ تو ملتا ہے مشکل سے اپنا گزارہ ہوتا ہے ان کی خدمت کہاں سے کریں ؟ لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ان کے باپ کا گزارہ ان سے بھی کم تھا لیکن اِس کے باوجود ان پر خرچ کرتے تھے۔ غرض ہر نسل کی نظر آگے کی طرف جا رہی ہے جس سے پتہ لگتا

☆ جب میں خطبہ کے بعد گھر آیا تو مجھے ایک خاتون نے بتایا کہ ہم پانچ عورتیں اکٹھی بیٹھی ہوئی تھیں۔ خطبہ کے بعد ہم نے ایک دوسرے سے اس کے پڑ دادا کا نام پوچھا تو پانچ میں سے صرف ایک کو پڑ دادا کا نام معلوم تھا۔

☆☆ بعد میں اندازہ لگوایا گیا تو وہ لوگ جنہوں نے ماں باپ کی طرف سے حصہ لیا ہے صرف دو سو کے قریب ہیں۔

ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر اولاد کی خواہش کا مادہ اِس لئے رکھا ہے تا کہ بنی نوع انسان کے تسلسل کو جاری رکھے اگر یہ خواہش نہ ہوتی تو دنیا کے واقعات کو دیکھ کر اکثر ماں باپ اولاد پیدا کرنے کے مخالف ہوتے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ماں باپ مصیبتیں اٹھاتے ہیں، دکھ سہتے ہیں، بھوکے رہتے ہیں، بچہ جننے کی وجہ سے ماؤں کو ہزاروں قسم کی بیماریاں لگ جاتی ہیں پھر بھی ان کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ بچے ہو جائیں۔ حالانکہ بچوں سے ان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا سوائے نیک اور وفا شعار اولاد کے۔ پھر بھی چھ چھ سات سات بچے ہونے پر بھی اگر درمیان میں وقفہ پڑ جائے تو عورتیں کہتی ہیں مدت سے بچہ نہیں ہوا ایک بچہ اَور ہو جائے۔ ساری عمر عورت کا خون اولاد کے پیدا کرنے میں بہتا چلا جاتا ہے مگر وہ پروا نہیں کرتی۔ کئی عورتیں منہ سے تو کہتی ہیں کہ ہمیں اولاد کی خواہش نہیں مگر ان کی باتوں سے عیاں ہو جاتا ہے کہ وہ صرف شرم وحیا کی وجہ سے ایسا کہہ رہی ہیں ورنہ اُن کا دل اولاد نہ ہونے کی وجہ سے زخمی ہوتا ہے۔

پس اولاد کی خواہش ایک طبعی خواہش ہے اور یہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ اس کے پیچھے جو جذبہ خدا تعالیٰ نے رکھا ہے وہ یہی ہے کہ نسلِ انسانی قائم رہے۔ گو انسان اس کو شکل یہ دیتا ہے کہ نام قائم رہے۔ گو نام بھی کچھ مدت تک قائم رہتا ہے۔ باپ کا نام بیٹے نے یاد رکھا یا دادا کا نام پوتے نے یاد رکھا۔ اور بعض خاندانوں میں چار چار پانچ پانچ پُشت تک بھی نام قائم رہتا ہے۔ لیکن بعض جگہ نام بالکل قائم نہیں رہتا۔ بیٹے باپ کا نام لینا اور یہ کہنا کہ ہمارے باپ کا یہ نام تھا پسند نہیں کرتے بلکہ وہ جگہیں چھوڑ دیتے ہیں جہاں ان کے باپ نے غربت میں زندگی گزاری ہو کیونکہ اُس جگہ رہنا وہ ہتک سمجھتے ہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کسی ہندو کا قصہ سنایا کرتے تھے کہ اُس نے مصیبت اٹھا کر اور تکلیف برداشت کر کے اپنے لڑکے کو پڑھایا لکھایا اور اسے گریجوایٹ کرایا۔ اُس وقت گریجوایٹ ہونا بھی بڑی بات تھی اس لئے وہ ای۔ اے۔ سی ہو گیا۔ باپ اِس بات کو سن کر کہ میرا لڑکا ڈپٹی ہو گیا ہے بہت خوش ہوا۔ اُس وقت بڑے سے بڑا درجہ یہی سمجھا جاتا تھا کہ کوئی ہندوستانی ای۔ اے۔ سی ہو جائے۔ اُس وقت اسے گورنری کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے وہ بڑے شوق سے اپنے بیٹے سے ملنے کے لئے گیا کہ ذرا میں بھی جا کر اس کی عزت میں شریک ہوں۔ اور میں بھی لوگوں سے سلام

کراؤں کہ میرا بیٹا ڈپٹی ہے۔ جب یہ وہاں پہنچا تو ڈپٹی صاحب کرسیاں بچھا کر بیٹھے ہوئے تھے اور اس کے دوست ای۔ اے۔ سی۔ تحصیلدار، رؤساء اس کے پاس بیٹھے تھے۔ وہ تمام سُوٹڈ بُوٹڈ اور عمدہ لباس میں تھے۔ یہ بھی اپنی دھوتی اور جنیوؑ 1 پہنے ایک کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔ اس کے لباس سے غربت ٹپکتی تھی۔ پہلے بھی غریب تھا پھر لڑکے کی تعلیم اور پڑھانے لکھانے پر جو کچھ تھا وہ سب خرچ ہو چکا تھا اب اُس کا سارا اثاثہ دھوتی اور جنیوؑ ہی رہ گیا تھا۔ یہ بڑے فخر سے جا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اول تو اسے امید تھی کہ میرا بیٹا آگے آکر گلے ملے گا جیسا پہلے ملا کرتا تھا۔ مگر بیٹے نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ اب تو اِس بات میں کچھ کمی آگئی ہے مگر پہلے زمانہ میں چونکہ ہندوستانیوں کو اعزاز بہت کم ملتا تھا اس لئے ایسے لوگ دوسرے لوگوں کو بہت حقیر سمجھتے تھے۔ چنانچہ اس مجلس میں بیٹھے ہوئے لوگوں نے بھی ایک شخص کو جو اِس قسم کا گندا لباس، میلی سی دھوتی اور جنیوؑ لٹکائے ہوئے تھا کُرسی پر بیٹھے دیکھا تو اس امر کو بُرا منایا اور حقارت سے کہنے لگے کہ یہ کون بد تہذیب ہے جو بایں ہیئت ہماری مجلس میں آبیٹھا ہے؟ اس نالائق بیٹے نے بھی اپنی عزت جتانے کے لئے جسے وہ عزت سمجھتا تھا کہا "ایہہ ساڈے گھر دے ٹہلئے نے" یعنی ہمارا پرانا نوکر ہے اس لئے گستاخ ہو گیا ہے۔ باپ نے سنا اور حقیقت سمجھ لی کہ میرے بیٹے کے دماغ میں تغیر آچکا ہے۔ وہ غصہ سے کھڑا ہو گیا اور ان لوگوں کو مخاطب ہو کر کہا۔ کہ "جی میں اینہا دا ٹہلیا نہیں اینہا دی ماں دا ٹہلیا ہاں" یعنی میں ان کا نوکر نہیں ان کی ماں کا نوکر ہوں۔ اس فقرہ سے وہ لوگ حقیقت سمجھ گئے۔ ان کے اندر کچھ حیا تھی وہ اس کے بیٹے کو ملامت کرنے لگے اور کہا کہ بڑا افسوس ہے آپ کو چاہیے تھا کہ آپ ہمیں اِن سے ملواتے اور ان سے انٹروڈیوس کراتے۔ لاعلمی میں اِن کی شان میں ہم سے ایسے الفاظ نکل گئے جو نامناسب تھے۔ تو ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنے ماں باپ کی کمزوری اور اُن کی ادنیٰ حالت کو دیکھ کر اپنی جگہیں چھوڑ دیتے ہیں، ملک بدل لیتے ہیں، وطن جانا چھوڑ دیتے ہیں تاکہ پتہ نہ لگ سکے کہ ان کے ماں باپ غریب تھے اور تاکہ وہ غریب والدین کی اولاد ہونے کی وجہ سے لوگوں کی نظروں میں ذلیل نہ ہو جائیں۔ پس دونوں قسم کے گروہ پائے جاتے ہیں۔ اور جو گروہ ماں باپ کا نام قائم رکھنے والا ہے وہ بھی لمبے عرصہ تک نام قائم نہیں رکھ سکتا۔ اگر ماں باپ کا نام لمبے عرصہ تک

قائم رکھنا ممکن ہوتا تو ہمارے ملک میں میراثیوں کو جو شجرۂ نسب یاد کرایا جاتا ہے یہ نہ کرایا جاتا۔ کسی نے شعر کہا ہے

عجب طرح کی ہوئی فراغت جو بار اپنا گدھوں پہ ڈالا

تو جس طرح گدھوں پر بوجھ ڈال کر فراغت حاصل کی جاتی ہے یہ بھی اسی طرح کی فراغت ہے کہ میراثیوں کو اپنے باپ دادوں کے نام یاد کرا دیئے جاتے ہیں اور کہہ دیا جاتا ہے کہ چلو چھٹی ہوئی اب باپ دادا کا نام یاد رکھنے کی زحمت سے آزادی حاصل ہو گئی ہے۔ پس انسان کے اندر اولاد کی خواہش پیدا کرنے میں اصل حکمت یہ نہیں کہ باپ دادا کا نام قائم رکھا جائے بلکہ اصل میں تو خدا تعالیٰ کا منشاء یہ ہے کہ بنی نوع انسان کے تسلسل کو اس حکمت کے ماتحت قائم رکھا جائے اور اس حکمت کے ماتحت اُس نے ماؤں اور باپوں کے دلوں میں اولاد کی خواہش پیدا کر دی ہے۔ اور سب مرد اور سب عورت اِلَّا مَا شَاءَ اللّٰہُ جس کی فطرت مسخ ہو چکی ہو یا جو اپنی قوتِ مردمی کھو چکا ہو اس خواہش کے ماتحت ہی اولاد پیدا کرتے چلے جاتے ہیں۔ گھر میں کھانے کو کچھ نہیں ہوتا، فاقے کر رہے ہوتے ہیں مگر پھر بھی قبروں پر جا کر منتیں کر رہے ہوتے ہیں کہ اولاد ہو جائے۔ بھلا کوئی پوچھے ایک روٹی میں تم گزارہ کرتے ہو اگر ایک اَور آ گیا تو تم نصف کھاؤ گے۔ اگر ان کو یہ سمجھاؤ تو کہتے ہیں ہاں جی ہم آدھی ہی کھا لیں گے مگر بچہ ہو جائے۔

تو یہ انسانی فطرت کا ایک تقاضا ہے اور نسلِ انسانی کے قائم رکھنے کے لئے خدا نے اولاد کی خواہش پیدا کر دی ہے۔ اس کے مقابلہ میں دین اور تقویٰ کو قائم رکھنے کے لئے اچھی نسل کا تقاضا ہوتا ہے۔ جس طرح نسلِ انسانی کے قائم رکھنے کے لئے اولاد کا تقاضا ہوتا ہے۔ اِسی طرح نیک اور متقی نسل قائم رکھنے کے لئے اچھی اولاد کا تقاضا ہوتا ہے۔ جس طرح وہ تقاضا اگر ماں باپ کے دماغوں میں کمزور ہو جائے تو نوع انسانی تباہ ہو جائے اِسی طرح اگر یہ تقاضا کمزور ہو جائے کہ دین اور تقویٰ کو قائم رکھنے کے لئے نیک اولاد پیدا کریں جو کام کرنے والی اور محنتی ہو تو قوم تباہ ہو جائے۔ ذرا ایک منٹ کے لئے اس بات کا خیال کر کے تو دیکھو کہ اگر عورتوں اور مردوں کے دل سے اولاد پیدا کرنے کی خواہش مٹ جائے تو کیا نسلِ انسانی مٹ نہ

جائے گی؟ اور دس پندرہ یا بیس سال کے اندر نئی اولاد کا ملنا مشکل ہو جائے گا کہ نہیں ؟اِسی طرح سوچ لو کہ اگر نیک اور محنتی نسل پیدا کرنے کی خواہش مٹ جائے تو پندرہ بیس سال تک مذہب تباہ ہو جائے گا۔ کیونکہ جب نیک نسل پیدا کرنے کی خواہش نہ ہو گی تو وہ تدابیر بھی اختیار نہیں کی جائیں گی جن سے آئندہ نسل نیک، متقی، دیندار اور محنتی ہو۔ جس طرح محض اولاد پیدا کرنے کے لئے لوگ دعائیں کرتے اور دعائیں کراتے ہیں اور وہی لوگ تو ٹونے ٹوٹکے کرتے ہیں، قبروں پر جاتے ہیں، چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔ اسی طرح ایک مذہبی انسان کے لئے ضروری ہے کہ اس کے اندر اچھی نسل پیدا کرنے کی خواہش ہو۔ اور وہ اس خواہش کو پورا کرنے کے لئے ایسے ذرائع استعمال کرے جن سے اولاد نیک، متقی، دیندار اور محنتی ہو۔

میں نے بارہا جماعت کو توجہ دلائی ہے کہ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ سلسلہ اچھے نام کے ساتھ اور حقیقی معنوں میں قائم رہے تو ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنی آئندہ نسل کو ایک متقی اور محنتی بنائیں۔ آج دنیا میں مسلمان کہلانے والے بھی موجود ہیں، عیسائی کہلانے والے بھی موجود ہیں، ہندو کہلانے والے بھی موجود ہیں۔ آخر یہ سب مذاہب شیطان کی طرف سے تو نہیں تھے۔ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ہی کرشنؑ کو بھیجا تھا اللہ تعالیٰ نے ہی رامچندرؑ کو بھیجا تھا، اللہ تعالیٰ نے ہی حضرت مسیحؑ کو بھیجا تھا۔ یہ نہیں کہ چونکہ ان کو نَعُوْذُ بِاللّٰہِ شیطان نے بھیجا تھا اس لئے ان کی قومیں شیطان کے قبضہ میں چلی گئیں۔ بلکہ جس خدا نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو بھیجا اُسی خدا نے آپ کے آقا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا۔ اُسی خدا نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے حضرت عیسیٰؑ کو بھیجا۔ اُسی خدا نے حضرت موسیٰؑ کو بھیجا۔ اُسی خدا نے حضرت کرشنؑ کو بھیجا اور اُسی خدا نے حضرت رام چندرؑ کو بھیجا تھا۔ اور جن معجزات اور جن کرامات کے ساتھ خدا تعالیٰ نے ہماری جماعت کو قائم کیا اِن سے بڑھ کر معجزات اور کرامات کے ساتھ خدا تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جماعت کو قائم کیا۔ اور گو ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ جو معجزات حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو ملے تھے سوائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جو آپ سے بہر حال بلند مرتبت تھے اَور کسی نبی کو ایسے معجزات نہیں ملے۔ مگر بہر حال خدا کی قدرتوں سے ہی عیسیٰؑ کی جماعت قائم ہوئی۔ خدا

کی قدرتوں کے ساتھ ہی موسیٰؑ کی جماعت قائم ہوئی۔ خدا کی قدرتوں کے ساتھ ہی کرشنؑ کی جماعت قائم ہوئی اور خدا کی قدرتوں کے ساتھ ہی رامچندرؑ کی جماعت قائم ہوئی۔ مگر کہاں ہیں اب وہ نشانات اور کہاں ہیں اب وہ معجزات جو دلوں کو پگھلا دیتے تھے اور جو حیوانوں کو انسان اور انسان کو فرشتے اور فرشتہ خصلت انسانوں کو خدا کے مقرب اور عرش نشین بنا دیتے تھے۔ کہاں ہیں وہ کرامتیں اور وہ معجزات جو رامچندرؑ اور کرشنؑ نے دکھائے جنہوں نے ہندوؤں کی کایا پلٹ دی تھی۔ کہاں ہیں وہ نشانات جو قرآن مجید میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ نو بڑے بڑے نشانات حضرت موسیٰؑ کو دیئے گئے تھے۔ کیا ان نشانات میں سے نصف یا ان کا چوتھا حصہ یا ان کا کوئی حصہ بھی اب دنیا میں باقی ہے؟ حضرت عیسیٰؑ کی نسبت عیسائی تو بیان کرتے ہی ہیں مسلمان بھی اُن کو ایسا بڑھا چڑھا کر دکھاتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ کو تمام انبیاء سے بڑھا دیتے ہیں۔ ان کے معجزات میں سے علمِ غیب، جانوروں کا پیدا کرنا، مُردوں کو زندہ کرنا، بیماروں کو پُھونک مار کر شفا دینا بہت کچھ بیان کرتے ہیں۔ لیکن جو معجزات بھی تھے بڑے یا چھوٹے وہ انبیاء کی سنت کے مطابق تھے۔ کیا آج ان معجزات میں سے کوئی بھی باقی ہے؟ حضرت مسیحؑ نے کہا ہے کہ اگر تم میں ایک رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان ہو گا اور تم پہاڑوں کو حکم دوگے کہ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ چلے جائیں تو تمہارے حکم سے پہاڑ بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ چلے جائیں گے۔ 2 مگر کیا ان معجزات میں سے کچھ بھی اب باقی ہے؟ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جیسا انسان دنیا نے کہاں جنا اور کب جن سکتی ہے۔ وہ جو تمام بنی نوع انسان کا مقصود اور مدعا تھا، جس کی خاطر دنیا پیدا کی گئی، جو کرامتیں آپؐ نے دکھائیں اور جو معجزات آپ سے ظاہر ہوئے صحابہ کرام کی قوتِ عملیہ، تقویٰ اور اخلاص سے پتہ لگتا ہے کہ ان کا سکھانے والا کتنا بڑا انسان تھا۔ مگر کیا وہ کرامتیں آج مسلمانوں میں نظر آتی ہیں؟ آج وہ کرامتیں اور وہ نشانات مسلمانوں کے دلوں میں بھی گُدگُدی اور اُن کے دماغ میں بھی ہیجان پیدا کرتے ہیں مگر ایک ذرہ بھر حرکت بھی تو ان میں نہیں پائی جاتی۔ آخر یہ کیوں ہے؟ صرف اس لئے کہ بعد میں آنے والی نسلوں نے نشانات دکھانے والے سے تعلق قطع کر لیا۔ ورنہ خدا تعالیٰ میں نشان دکھانے کی قدرت تو پھر بھی موجود تھی۔ اور نسل بھی موجود تھی۔ مگر اس زنجیر کے

ٹوٹ جانے اور تسلسل کے کٹ جانے کی وجہ سے وہ ان نشانات سے فائدہ حاصل نہ کر سکی۔ پس جو پہلوں سے ہوُا وہی ہمارے ساتھ بھی ہو گا۔ کیونکہ جو قانون پہلے تھا وہی اب بھی جاری ہے۔ ابھی تو ہماری ابتدائی حالت ہے۔ ابھی تو ہماری حالت ایسی ہی ہے جیسے کونپل نکلتی ہے۔ اگر اس حالت میں بھی ایثار کا مادہ کم ہو جائے، قربانی کا مادہ کم ہو جائے، عقل اور محنت سے کام کرنے کا مادہ کم ہو جائے اور دنیا داری بڑھ جائے تو یقیناً ہمیں مستقبل کے آنے سے پہلے ہی موت کے لئے تیار ہو جانا چاہیے۔ میں نے بار بار اس بات کی طرف جماعت کو توجہ دلائی ہے مگر میں دیکھتا ہوں کہ ابھی اِس طرف پوری توجہ نہیں کی گئی۔

ہمارے نوجوان جو آگے آرہے ہیں ان کے اندر محنت کی عادت کم ہے۔ کام سے جی چُراتے ہیں، ذکرِ الٰہی کا مادہ ان میں کم ہے۔ میں نے خدام کو کئی دفعہ توجہ دلائی ہے کہ نوجوانوں کے اندر وہ یہ مادہ پیدا کریں مگر جہاں انہوں نے کچھ کام کیا ہے وہاں یہ حقیقی کام صفر کے برابر نظر آتا ہے۔ مجھے سب سے زیادہ جماعت کے لوگوں سے کام پڑتا ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ حقیقی قربانی اور محنت نوجوانوں میں کم نظر آتی ہے۔ اَور تو اَور یہ واقفین جو کہتے ہیں ہم نے زندگی قربان کر دی ہے اِن واقفین میں سے بھی بعض غیر معقول دماغ کے ایسے ہیں جو کہتے ہیں ہم نے کام کی ڈائری اِس لئے نہیں دی کہ وقت زیادہ ہو گیا تھا۔ ایک طرف وہ قوم ہے جسے ہم کافر اور بے دین کہتے ہیں جو چھ چھ سات سات دن بغیر آرام کرنے کے متواتر میدانِ جنگ میں لڑتے ہیں اور دوسری طرف یہ نوجوان ہیں جنہوں نے اپنی زندگیاں دین کی خدمت کے لئے وقف کی ہیں لیکن یہ کہتے ہیں کہ چونکہ چھ بجے تک کام کیا تھا اور وقت زیادہ ہو گیا تھا اِس لئے ڈائری لکھنی مشکل تھی۔ اگر ایک دن زیادہ پڑھنا پڑ جائے تو کہتے ہیں آج زیادہ پڑھنا پڑ گیا تھا اس لئے باقی کام نہیں کیا۔ اگر ان کا یہ حال ہے جو واقفین ہیں اور جو یہ کہتے ہیں کہ اسلام کے لئے ہم سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار ہیں تو غیر واقفین کا کیا حال ہو گا۔ ان کے اندر بھی ابھی وہ بیداری اور وہ روح نظر نہیں آتی اور ان کے اندر بھی ابھی وہ ارادہ پیدا نہیں ہوا کہ ان میں سے کسی کے سپرد کوئی کام ہو تو وہ کہے کہ میں مر جاؤں گا مگر اپنے کام کو پورا کر کے چھوڑوں گا۔ اگر ان کے اندر عام مومن کے ایمان کا کروڑواں حصہ بلکہ دس کروڑواں حصہ بھی ہوتا تو

اگر سارا دن کام کرنے کے بعد بارہ گھنٹے اَور لگتے تھے تو اِن کے اندر یہ خیال پیدا نہیں ہونا چاہیے تھا کہ انہوں نے بارہ گھنٹے یا بیس گھنٹے یا چوبیس گھنٹے کام کیا ہے اس لئے اب کام ختم کرنے سے پہلے آرام کرنا چاہیے۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوتا کہ یہ کام کرتے کرتے مر جاتے اور کیا ہوتا؟ پاگل ہی ہیں جو کہا کرتے ہیں کہ مرنے سے بڑھ کر کوئی اور مصیبت ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کسی مجسٹریٹ نے ایک ملزم کو یہ سزا سنائی کہ اُس کو پھانسی دے دی جائے۔ تو وہ کہنے لگا کہ اس سے تو بہتر ہے کہ مجھے مروا ہی دیں۔ تو اس قسم کی باتیں جاہلوں اور پاگلوں کی طرف تو منسوب کی جا سکتی ہیں مگر ایک واقف جو یہ کہہ کر آتا ہے کہ میں مرنے کے لئے آیا ہوں کیا اس کے منہ سے اس قسم کے لفظ بیہودہ اور پوچ عذر نکلنے زیب دیتے ہیں؟ ایک شخص کو جو واقفِ زندگی تھا میں نے کام کے لئے سندھ بھیجا۔ چار دن کے بعد وہ بھاگ آیا اور آکر خط لکھ دیا کہ وہاں کام سخت تھا اس لئے میں اس کام کو چھوڑ کر بھاگ آیا ہوں اور اب روزانہ معافی کے خطوط لکھتا رہتا ہے۔ حالانکہ دینی جنگ کے میدان سے بھاگنے والے کو قرآن کریم جہنمی قرار دیتا ہے۔ اس کے لئے معافی کیسی؟

یہ تحریک جدید کے واقفِ زندگی ہیں۔ ان کی مثال کشمیریوں کی سی ہے۔ جن کے متعلق کہتے ہیں کہ راجہ نے ان کو بلایا اور کہا کہ سرکار کو لڑائی پیش آگئی ہے سرکار نے ہم سے بھی مدد کے لئے فوج مانگی ہے۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ تم بھی لڑنے کے لئے جاؤ۔ جو افسر راجہ سے بات کرنے کے لئے آیا تھا اُس نے کہا حضور! آپ کا نمک کھاتے رہے ہیں، آپ کا حکم سر آنکھوں پر، ساری عمر آپ کا نمک اِسی لئے تو کھاتے رہے ہیں کہ لڑائی کریں۔ اگر مہاراج اجازت دیں تو میں ذرا فوجیوں سے بات کر آؤں؟ مہاراج نے اجازت دے دی۔ جب فوجیوں سے بات کر کے واپس آیا تو عرض کیا مہاراج! فوج تیار ہے ان کو کوئی عذر نہیں مگر وہ ایک عرض کرتے ہیں۔ راجہ نے کہا کیا؟ کہنے لگا حضور! سنا ہے پٹھانوں کے ساتھ لڑائی ہے۔ پٹھان بہت سخت ہوتے ہیں اگر ہمارے ساتھ پہرہ کا انتظام ہو جائے تو ہم لڑائی کے لئے تیار ہیں۔ تو ایسے ہی ہمارے نوجوان پیدا ہو رہے ہیں۔ وہ قربانیوں کے موقع سے ڈرتے ہیں، محنت سے کام کرنے سے ڈرتے ہیں اور پھر وہ اپنے آپ کو واقفِ زندگی اور مجاہد کہتے ہیں۔ اور ہر شخص اپنے

نام کے ساتھ واقف اور مجاہد لکھنے کے لئے تیار ہے مگر کام کرنے کے وقت ان کی جان نکلتی ہے۔ مگر بہر حال یہ لوگ تو وہ ہیں جنہوں نے کچھ نہ کچھ تو قربانی کی ہے ان میں بعض ایسے ہیں جو دنیوی طور پر اس سے زیادہ کما سکتے تھے جتنا ان کو یہاں گزارہ ملتا ہے۔ لیکن دوسرے نوجوانوں کی حالت تو اَور بھی بد تر ہے۔

میں نے بار بار توجہ دلائی ہے مگر خدام نے کوئی ایسا رستہ نہیں نکالا جس کے ساتھ نوجوانوں کو با قاعدہ اور متواتر کام کرنے کی عادت ہو اور وہ یہ نہ کہیں کہ وقت زیادہ ہو گیا تھا اس لئے کام رہ گیا۔ بلکہ ان کے دل میں یہ احساس ہو کہ جو کام ہمارے سپرد کیا جائے ہم نے اسے ضرور کرنا ہے اور اسے ختم کر کے چھوڑنا ہے چاہے ڈیسک پر بیٹھے بیٹھے یا میز پر بیٹھے بیٹھے یا فرش پر بیٹھے بیٹھے یا چلتے چلتے یا کام کرتے کرتے میری جان ہی کیوں نہ نکل جائے۔ جب تک یہ مادہ اور یہ حِسّ پیدا نہیں ہوتی اُس وقت تک ہم کبھی ترقی نہیں کر سکتے اور کبھی ہم تسلی اور اطمینان کے ساتھ یہ امانت اگلی نسل کے سپرد نہیں کر سکتے۔

احمدیت کی محبت، اخلاص اور تربیت جھگڑوں سے روکتی ہے۔ مگر لوگ معمولی معمولی بات پر جھگڑتے ہیں، عُہدوں پر جھگڑ کر ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھنا چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ سارا نقص اِس وجہ سے ہے کہ احمدیت کی محبت دل میں نہیں۔ اگر احمدیت کی محبت ہوتی تو کچھ بھی ہو جاتا وہ اس کی پروا نہ کرتے۔ یہ لوگ ہسپتالوں میں جاتے ہیں، عدالتوں میں جاتے ہیں۔ کہیں ان کو چپڑاسی تنگ کرتے ہیں، کہیں ان کو کمپاؤنڈر (Compounder) دِق کرتے ہیں۔ یہ ان ساری ذلتوں کو برداشت کرتے ہیں اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ ہمارے عزیز کی جان یا ہماری عزت خطرے میں ہے۔ اگر اسلام کی جان اور اسلام کی عزت کی قدر ان کے دل میں ہوتی تو یہ آپس میں ذرا ذرا سی بات پر کیوں جھگڑتے۔ تو فرق یہی ہے کہ اپنے عزیز کی جان یا اپنی عزت ان کو زیادہ پیاری ہے اس لئے کچہریوں یا ہسپتالوں میں مجسٹریٹوں یا ڈاکٹروں کی جھڑکیاں کھاتے ہیں اور ان کو برداشت کرتے ہیں۔ ان سے گالیاں سنتے ہیں اور ہنستے ہوئے کہتے چلے جاتے ہیں کہ حضور! ہمارے مائی باپ ہیں جو چاہیں کہہ لیں۔ مگر خدا کے سلسلہ اور خدا کے نظام میں معمولی بات سننے کے لئے بھی تیار نہیں ہوتے۔ وہاں ہسپتالوں میں دائیاں اور

نرسیں اِن کو جھڑکتی ہیں، ڈاکٹر حقارت سے کہتا ہے چلے جاؤ۔ تو یہ دروازہ کے پاس جا کر چُھپ کر کھڑا ہو جاتا ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ اگر میں نے اس کو ناراض کیا تو میرے عزیز کی جان خطرہ میں پڑ جائے گی۔ لیکن ان کو احمدیت عزیز نہیں ہوتی، اسلام عزیز نہیں ہوتا اس لئے سلسلہ اور نظام کی خاطر ادنیٰ سا بُرا کلمہ سننے کی تاب نہیں رکھتے۔

دوسری چیز محنت ہے۔ اگر واقع میں احمدیت کی محبت ہوتی تو ضرور نوجوانوں کے اندر محنت کی بھی عادت ہوتی۔ مگر ان کے کاموں میں محنت اور باقاعدگی سے کام کرنے کی عادت بالکل نہیں۔ اور اگر کوئی کسی کو اچھی بات بھی کہہ دے تو وہ چِڑ جاتا ہے کہ اس نے مجھے ایسی بات کیوں کہی۔ پس میں پھر ایک دفعہ خدام کو توجہ دلاتا ہوں کہ وہ مشورہ کر کے میرے سامنے تجاویز پیش کریں۔ میں نے بھی اس پر غور کیا ہے اور بعض تجاویز میرے ذہن میں بھی ہیں۔ لیکن پہلے میں جماعت کے سامنے اس بات کو پیش کرتا ہوں کہ وہ مشورہ دیں کہ آئندہ نسلوں میں قربانی اور محنت اور کام کو بروقت کرنے کی روح پیدا کرنے کے لئے ان کی کیا تجاویز ہیں۔ مگر یہ شرط ہے کہ جو شخص تجویز پیش کرے وہ اپنی اولاد کو پہلے پیش کرے۔ بعض لوگ لکھنے کو تو لکھ دیتے ہیں کہ اس طرح سلوک کیا جائے، اس طرح نوجوانوں پر سختی کی جائے مگر جب خود اُن کے بیٹوں کے ساتھ سختی کی جائے تو شور مچانے لگ جاتے ہیں۔ تو جو شخص اپنی تجاویز لکھے وہ ساتھ یہ بھی لکھے کہ میں اپنی اولاد کے متعلق سلسلہ کو اختیار دیتا ہوں کہ وہ جو قانون بھی بنائیں میں اپنی اولاد کے ساتھ اس سلوک کو جائز سمجھوں گا۔ اسی طرح خدام الاحمدیہ آپس میں مشورہ کر کے مجھے بتائیں کہ نوجوانوں کے اندر محنت اور استقلال سے کام کرنے کی عادت پیدا کرنے کے لئے اُن کی کیا تجاویز ہیں۔ نوجوان کام کے موقع پر سو فیصدی فیل ہو جاتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں یہ مشکل پیش آگئی اس لئے کام نہیں ہو سکا۔ وہ نوے فیصدی بہانہ اور دس فیصدی کام کرتے ہیں۔ یہ حالت نہایت خطرناک ہے اس کو دیر تک برداشت نہیں کیا جا سکتا۔

پس خدام مجھے بتائیں کہ نوجوانوں کے اندر محنت سے کام کرنے اور فرائض کو ادا کرنے میں ہر قسم کے بہانوں کو چھوڑنے کی عادت کس طرح پیدا کی جائے۔ مشورہ کے بعد ان

تجاویز پر غور کر کے پھر میں تجاویز کروں گا اور جماعت کے نوجوانوں کو اِن کا پابند بنایا جائے گا۔ پہلے اسے اختیاری رکھیں گے تا کہ یہ دیکھا جائے کہ کون کونسے ماں باپ ہیں جو اپنے بچوں کو سلسلہ کی تعلیم دلانا اور ان کی تربیت کرانا چاہتے ہیں۔ اور جس وقت ہم اس میں کامیاب ہو جائیں گے اور ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ ہمارا طریق درست ہے تو پھر دوسرا قدم ہم یہ اٹھائیں گے کہ اسے لازمی کر دیا جائے۔

بہر حال یہ کام ضروری ہے اگر ہم نے یہ کام نہ کیا تو احمدیت کی مثال اس دریا کی ہو گی جو ریت کے میدان میں جا کر خشک ہو جائے۔ اور جس طرح بعض بڑے بڑے دریا صحراؤں میں جا کر اپنا پانی خشک کر دیتے ہیں پانی تو ان میں اُسی طرح آتا ہے مگر صحرا میں جا کر خشک ہو جاتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی نالیاں پہاڑوں سے گزرتی ہوئی مِیلوں مِیل تک چلی جاتی ہیں مگر بڑے بڑے دریا ریت کے میدانوں میں جا کر خشک ہو جاتے ہیں۔ پس یہ مت خیال کرو کہ تمہارے اندر معرفت کا دریا بہہ رہا ہے۔ اگر تم میں سستی، کم محنتی اور غفلت کا صحرا پیدا ہو گیا تو یہ دریا اس کے اندر خشک ہو کر رہ جائے گا۔ چھوٹی چھوٹی ندیاں مبارک ہوں گی جو پہاڑوں کی وادیوں میں سے گزر کر مِیلوں مِیل تک چلتی چلی جاتی ہیں مگر تمہارا دریا نہ تمہارے لئے مفید ہو گا اور نہ دنیا کے لئے مفید ہو گا۔

پس یہ آفت اور مصیبت ہے جس کو ٹلانا ضروری ہے۔ اس آفت کو دور کرنے کے لئے پہلے میں جماعت کے دوستوں سے فرداً فرداً اور خدام الاحمدیہ اور انصار اللہ سے بحیثیت جماعت مشورہ چاہتا ہوں۔ انصار اللہ سے اِس لئے کہ وہ باپ ہیں اور خدام الاحمدیہ سے بحیثیت نوجوانوں کی جماعت ہونے کے کہ ان پر ہی اِس سکیم کا اثر پڑنے والا ہے۔ اور ہر فرد سے جس کے ذہن میں کوئی نئی یا مفید تجویز ہو پوچھتا ہوں کہ وہ مجھے مشورہ دے۔ پھر میں ان سب پر غور کر کے فیصلہ کروں گا کہ آئندہ نسل کی اصلاح کے لئے ہمیں کونسا قدم اٹھانا چاہیے۔"

(الفضل مورخہ 11 مئی 1945ء)

1: جَنیُو: وہ بٹا ہوا دھاگا جسے ہندو لوگ بدھی کی طرح گلے میں ڈالے رہتے ہیں۔

2: متی باب 17 آیت 20